© rasailojaraid.com

محمد یاسین ظفر
(پرنسپل جامعہ سلفیہ)

گزارش احوال واقعی!

پاکستان دنیا میں واقعی ایک عجوبہ ہے جہاں آئے روز ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ہم ایشیا میں رہتے ہوئے یورپ کے خواب دیکھتے ہیں۔حال ہی میں وقت کی تبدیلی اسکا بڑا ثبوت ہے۔اسی طرح موت کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کرنے کا شور یورپ کی نقل کے سوا کچھ نہیں۔کیسی بد نصیبی ہے کہ جو لوگ بھی اقتدار میں آجاتے ہیں۔وہ یورپی ممالک کی خوشنودی کے لیے عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں۔تاکہ وہ ان کی وفاداری کا یقین کر لیں۔کوئی کتے اٹھا کر تصاویر بنواتا ہے تو کوئی اسلام کو برا بھلا کہتا ہے۔کوئی مدارس کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا ہے۔تو کوئی اسلامی حدود کو وحشیانہ قرار دیتا ہے۔اس کے باوجود یورپ والے مطمئن نہیں ہوتے۔اور ھل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں۔لیکن افسوس کہ اس "کار خیر" میں مزید اضافہ اس وقت ہوتا ہے۔جب بعض اہل قلم بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔اور اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہیں۔

گذشتہ دو ہفتوں سے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کی بات زیر بحث ہے۔پاکستانیوں کی اکثریت اس کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرا چکی ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔حکمران اقتدار کے نشے میں ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔اوران کی ساری ہمدردیاں قاتلوں،درندوں کے ساتھ ہیں۔یہی حال کچھ کالم نگاروں کا ہے۔جو اُجرت پر کالم نویسی کرتے ہیں۔اور پیشہ ور صحافی ہیں۔آئے دن ایسی نامعقول باتیں احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔جو قانوناً،اخلاقاً اور عقلاً درست نہیں ہیں۔قلم کی حرمت کو پامال کرتے ہیں۔اور ہزاروں مقتول خاندانوں کی دل آزاری کرتے ہیں۔

ہر باشعور شہری یہ بات جانتا ہے کہ پاکستان میں فوجداری مقدمات کے فیصلے برٹش لاء کے مطابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیے جاتے ہیں۔ قتل عمد میں قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مقدمہ سیشن جج کی عدالت سے سپریم کورٹ تک پہنچتا ہے اور طرفین کے وکلاء بحث میں حصہ لیتے ہیں۔ جرم ثابت ہونے کی پاداش میں سزا دی جاتی ہے۔ جبکہ آخری اپیل صدر مملکت سے کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ گنجائش بھی آخر میں رکھی گئی کہ اگر قاتل مقتول خاندان سے معافی حاصل کر لے تو سزا ختم ہو سکتی ہے۔

اب اگر وزیر اعظم پاکستان سزا موت کو عمر قید میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں سو بار یہ سوچنا چاہیے کہ مقتول خاندان کا کیا بنے گا۔ جب کہ قاتل پہلے ہی ان کا چراغ گل کر چکا ہے۔ اور مقدمات پر لاکھوں روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اس امید پر کہ قاتل کو قانون کے مطابق سزا مل جائے۔

اب ذرا اس کالم کا جائزہ لیں جو 30 جون کو روزنامہ ایکسپریس میں "ایک گذارش" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں کالم نگار "جناب حمید اختر" نے اگرچہ یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ شریعت کے بارے میں رائے دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مگر جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے اس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ لہٰذا ان کے جواب میں گذارش احوال واقعی کرنا چاہتے ہیں۔

کالم نگار نے مفسر قرآن جناب رحمت اللہ طارق کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں۔ نہایت مبہم اور غیر واضح ہیں۔ اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کے احکام واضح ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم تو یہ ہے۔ "الحلال بین والحرام بین وبینھما مشابھات واتقو الشبھات" کہ حلال وحرام بالکل واضح ہے۔ اگر کسی چیز کا حکم واضح نہیں تو اس پر شبہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے بچو۔ اس قدر آسان اور سہل دین کون سا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ظواہر کا تعلق ہے تو یہ ایک اقلیتی گروہ ہے جن کی کوئی حیثیت نہیں (جیسا کہ سزا موت کے خلاف یہ کالم نگار ہیں) رہی بات قتل مرتد کی تو اسے قتل عمد پر قیاس کرنا حماقت ہے۔ یہاں بحث صرف اور صرف قتل عمد کی ہو رہی ہے۔ لہٰذا جناب رحمت اللہ طارق کی کتاب کا حوالہ دینا بے محل ہے۔

کالم نگار کے نزدیک عمر قید کی سزائے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ عمر قید میں وہ روز مرتا ہے۔ جب کہ سزا موت میں یہ قصہ ایک لمحہ میں پاک ہو جاتا ہے۔ کیا نکتہ آفرینی ہے؟ یہ بات بھی منطقی اعتبار سے درست نہیں۔ کیونکہ سزا کا خوف انسان کو پریشان لاغر اور کمزور کرتا ہے۔ اگر قاتل کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس جرم کی پاداش میں اسے بھی موت کی سزا ملے گی تو یہ بات پریشانی کا باعث ہو سکتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ البتہ اگر اسے یہ معلوم ہو کہ اسے زیادہ سے زیادہ سزا عمر قید ہے تو اسے کیا پروا اور کیسی فکر وہ تو جیسے تیسے یہ سزا پوری کر لے گا۔ کیونکہ سزائے موت کا قیدی کیس کے حتمی فیصلے تک دس پندرہ سال قید کاٹ چکا ہوتا ہے۔ اب اگر عمر قید دے بھی دی جائے تو زیادہ سے زیادہ چار سال بعد وہ باہر آ جائے گا۔ اس لیے باقی سزا کو سابقہ قید سے منہی کر دیا جائے گا۔ اب ایک ایسا شخص جس نے انتقام غصے، حسد، کینہ، دشمنی، لالچ یا کسی بھی وجہ سے اپنے مدمقابل کو عمداً قتل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ اس کے بچے بے آسرا اور یتیم ہو گئے۔ بیوی لوگوں کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ بوڑھے ماں باپ دوسروں کے دست نگر ہو گئے۔ ان لواحقین کے ساتھ ذرا ہمدردی نہیں اور نہ رحم آتا ہے۔ مگر ظالم اور قاتل کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے تاکہ باہر آ کر دوبارہ مقتولین کے ورثاء کو للکارے اور ان کا جینا حرام کر دے۔ کیا بھلی سوچ ہے۔ یقیناً ہمارے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ آخر ان کالم نگاروں کے اس میں کیا مفادات ہیں؟ رہی بات! اجبار یا تشدد کی تو میرے خیال میں جو فیصلہ سیشن جج کرتا ہے۔ اور اگر وہی فیصلہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ برقرار رکھتی ہے اور پرویز مشرف جیسا آپ کا پسندیدہ صدر برقرار رکھتا ہے۔ تو اس میں جبر یا تشدد کیسے آیا۔ اگر ہے تو یہ فیصلہ علماء کا نہیں بلکہ عدالت کا ہے۔ انہیں مطعون کیجئے۔ آج کسی بھی عدالت میں کوئی عالم یا مفتی براجمان نہیں ہے۔ بلکہ کالم نگار کے پسندیدہ ماحول کے لوگ ہیں۔

کالم نگار کو یہ بھی دکھ ہے کہ یہ علماء کرام بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اور ضرورت سے زیادہ مال جمع کر لیتے ہیں۔ ان **بعض الظن اثم** کے تحت بدگمانی گناہ ہے۔ علماء کی اکثریت بوریا نشین ہے اور سفید پوشی کے ساتھ دن گزارتی ہے۔ اگر ان علماء سے مراد مولانا فضل الرحمٰن یا قاضی حسین احمد صاحب ہیں۔ تو یہ بجائے خود ایک الزام ہے کہ انہیں علماء میں شمار کیا جائے۔ کیونکہ یہ خالص سیاسی قائدین ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو علماء کے لیے پجیرو گاڑیاں حرام نہیں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں دے رکھیں تو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جلنے اور حسد کی ضرورت نہیں ہے؟

اس سے آگے کالم نگار نے جو باتیں تحریر کیں ہیں۔ اور جو استدلال کیا ہے۔ وہ بھی عجیب ہے فرماتے ہیں کہ پاکستان میں سود کا کاروبار کیا بند ہو گیا ہے؟ کیا اس ملک کے حاکم اپنے رہن سہن میں شریعت اور اسلامی احکامات پر عمل کر رہے ہیں۔ کیا ہمارا معاشرہ اسلامی مساوات کے اصولوں پر عمل پیرا ہو رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو جہاں اور بہت سے کام خلاف شرع ہو رہے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور سہی۔۔۔۔انا للہ۔قارئین یقیناً صاحب مضمون کے استدلال پر تعجب اور افسوس کر رہے ہونگے۔ یہ تو بالکل وہی بات ہے کہ کوئی شخص کہے چونکہ شہر میں بہت سے قحبہ خانے کھل گئے ہیں۔لہذا ایک قحبہ خانہ میرے گھر میں بھی کھل گیا تو کیا فرق پڑے گا؟ یقیناً یہ ایک بری مثال ہے۔لیکن ایسا کبھی کسی دانشور نے نہیں سوچا ہوگا کہ لوگ غیر قانونی غیر اخلاقی کام کر رہے ہیں۔تو آپ بھی اسی طرح کرنے لگے۔اس کی تازہ مثال معزول ججوں کی بحالی پر سامنے آئی۔جب کہ 3 نومبر کو پرویز مشرف نے انہیں پی سی او کے تحت معزول کیا تو سب کے نزدیک یہ ایک غیر قانونی اقدام تھا۔حتی کہ ق لیگ کے ذمہ داران نے بھی کھلے عام اسے غیر قانونی عمل تسلیم کیا ہے۔لیکن انہیں بحال کرنے کے لیے کوئی غیر قانونی راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔بلکہ آئین میں ترمیم کے ساتھ انہیں بحال کرنے کا پروگرام ہے۔بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایک غیر قانونی کام کو غیر قانونی طریقے سے بند نہیں کیا جاسکتا۔اگر معزول جج جو کہ غیر قانونی طریقے سے ہٹائے گئے ہیں بحال نہیں ہو سکتے ہیں۔تو سزائے موت پانے والے یہ قیدی جو بالکل قانون کے مطابق اس سزا کو پہنچے ہیں۔ایک فرمان کے مطابق کیونکر سزا سے بچ جائیں گے۔

جہاں تک بعض صدور نے موت کی سزاء ختم کی اس پر احتجاج نہیں ہوا بالکل غلط۔بلکہ ہمارا مطالبہ رہا ہے کہ یہ حق کسی صدر کو نہیں بلکہ ورثاء کو ہی ملنا چاہیے۔وہ چاہیں تو دیت بھی نہ لیں اور قاتل کو معاف کردیں۔

آخر میں کالم نگار کا یہ فرمان " کہ ہم ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتے جن کے خیال میں مجرموں کو ایسی رعایت دینے سے ملک میں جرائم بڑھ جائیں گے " یہ موصوف کی خام خیالی ہے۔آج قتل کی سزا موت ہونے کے باوجود روزانہ کتنے قتل ہو رہے ہیں۔اگر یہ سزا عمر قید میں بدل دی گئی تو پھر میدان کھلا ہے۔لوگ کسی صورت میں اپنے مقدمات عدالتوں میں لیکر نہیں جائیں گے۔بلکہ گلی محلوں اور سڑکوں پر اپنے فیصلے کریں گے۔اتنی آسان سی بات ان کالم نگاروں کو کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔

اب تو دہشت گردی اور سمگلنگ جیسی گھناونی وارداتوں میں ملوث افراد کے لیے بھی سزا موت ختم کی جارہی ہے۔اس کے بعد کیا کسر رہ جائے گی۔اب جو دہشت گرد بھی موقعہ واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اسے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ سزا پندرہ سال قید ہوگی۔جب کہ اس کے ہاتھوں بیسیوں لوگ جان بحق ہوئے۔کیا یہی انصاف ہے۔جس کا تقاضا آپ کالم نگار حضرات کر رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سزا کا بنیادی مقصد اس کی ہیبت کا قائم کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ لوگ اس کے ڈر سے جرم نہ کریں۔ اور معاشرہ میں امن قائم رہے۔ اگر یہ ہیبت ختم ہو جائے تو پھر جرم کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آج پاکستانی معاشرہ جرائم کا گڑھ بن چکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ طویل عدالتی نظام ہے۔ جس کی وجہ سے مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ایک مقدمہ کو کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ تب تک انصاف کا طالب خود اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ اگر فوری انصاف ملے۔ اور مجرموں کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ تو جرائم میں از خود کمی ہو جائے گی۔ اور لوگ بذات خود انتقام لینے کی بجائے عدالت میں جانا پسند فرمائیں گے۔

سزا میں تخفیف اس شکل میں تو ممکن ہے۔ جب اس سے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔ ایسی صورت میں اگر حکومت کوئی قدم اٹھاتی ہے۔ اور مجرم بھی اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور آئندہ اچھے چال چلن کا یقین دلاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کالم نگاروں کو اسلام کی بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چلیے اسلام کی روشنی میں نہیں عقلی طور پر غور فرمالیں۔ کہ قاتل اگر معافی چاہتا ہے تو وہ مقتول کے ورثاء سے رجوع کرے۔ وہ چاہیں دیت لیکر چھوڑ دیں۔ یا بغیر معاوضہ کے معاف کر دیں۔ کتنا آسان اور سادہ نظام ہے۔ جو عقل کے قریب ترین ہے۔ لیکن یہاں کا باوا نرالا ہے۔ ان کے نزدیک مقتول کے ورثاء اس سے زیادہ سزا کے معیار کے حقدار ہیں۔ لہذا قاتل کو آزاد کر دیا جائے۔ اسے مقتول کے ورثاء کا پابند نہ کیا جائے۔ اور باہر آکر جو چاہے کرتا پھرے۔

حکومت وقت ہوش کے ناخن لے۔ اور ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچ لے۔ تاکہ یہ قدم کل پچھتاوا نہ بن جائے۔ معاشرے میں موجود ایسے خاندانوں سے واسطہ پڑا ہے جن کے پیاروں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ بڑی مشکل سے قاتلوں کو گرفتار کرایا۔ اور عدالت نے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے انہیں سزا موت سنائی۔ مگر آج وہ دوبارہ خوف زدہ ہیں۔ اور وہ گواہان تو بے چارے ملک چھوڑنے کی سوچ رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر یہ سفاک لوگ باہر آگئے۔ تو ہمارے خاندان کا نام ونشان مٹا دیں گے۔ انہیں کون تحفظ فراہم کرے گا۔ آپ سات ہزار افراد کو معاف کر کے یقیناً ان کے خاندانوں کی دعا لیں گے۔ لیکن مقتولین کی فریاد کون سنے گا۔ ان کا موقف سنے بغیر کوئی فیصلہ ظلم پر مبنی ہوگا۔ اس لیے حکومت نت محتاط رہے۔ اور کالم نگاروں کی [illegible]ن پر کان نہ دھرے جو کالم اجرت لیکر لکھے گئے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

© rasailojaraid.com